اُردو آپ بیتی میں خاموش سماج کی آواز: ثقافتی اور معاشرتی حاشیوں کا مطالعہ

The Voice of the Silent Society in Urdu Autobiography: A Study of Cultural and Social Margins

ڈاکٹر محسن خالد محسن

لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ شاہ حسین ایسوسی ایٹ کالج، چوہنگ، لاہور

Abstract:
Urdu autobiography serves as a significant literary space where the voices of the silent and marginalized sections of society find expression. This study explores how Urdu autobiographical writings represent cultural and social margins that are often ignored or underrepresented in official histories and dominant narratives. By focusing on personal memories, lived experiences, and everyday realities, Urdu autobiographies document the lives of common people, peripheral communities, and socially neglected groups. These narratives reveal how culture, traditions, social practices, and power relations shape individual and collective identities. The article argues that Urdu autobiography functions not merely as a record of personal life but as an alternative socio-cultural document that preserves the history of the silent society. Through this lens, autobiography emerges as a powerful medium for understanding social hierarchies, cultural continuity, and the dynamics of marginalization within South Asian society.

Key Words: Urdu autobiography, silent society, cultural margins, social margins, marginal voices, socio-cultural history, identity, life writing

انسانی زندگی اور اس سے وابستہ تمام مظاہر و اشیاء کا دائرہ بالعموم تین بنیادی زمانوں پر محیط سمجھا جاتا ہے، ماضی، حال اور مستقبل۔ یہی تین ادوار وہ ستون ہیں جن پر پوری انسانی زندگی، سماجی شعور اور تاریخی تسلسل استوار ہے۔ گردشِ ایام کا یہ نظام کوئی نیا یا حادثاتی عمل نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے اسی ترتیب کے ساتھ قائم و دائم ہے اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ سلسلہ رہتی دنیا تک اسی طرح جاری و ساری رہے گا۔ انسان کی فکری تشکیل، عملی ترجیحات اور زندگی گزارنے کے طریقے انھی تین زمانی حوالوں کے باہمی ربط سے متعین ہوتے ہیں۔ ازلی حقیقت یہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے سے پہلے وقوع پذیر ہونے والے حالات، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے لیے راہیں متعین کرتا آیا ہے۔ ماضی اس کے لیے تجربے کا خزانہ ہے، حال عمل کی فضا فراہم کرتا ہے اور مستقبل امکانات اور توقعات کا افق کھولتا ہے۔ اسی لیے انسان ہمیشہ آثار، یادداشتوں، روایات اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی معلومات سے سیکھتا رہا ہے اور انھی کی بنیاد پر پیش بندی اور منصوبہ بندی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ عمل محض شعوری نہیں بلکہ اکثر لاشعوری سطح پر بھی جاری رہتا ہے، جو انسانی فطرت کا بنیادی حصہ ہے۔

ماہرینِ سماجیات، بشریات اور سائنس دانوں کے محتاط مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی اور دنیا کی عمر ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں برسوں پر محیط ہے۔ ارتقائی مراحل کے ابتدائی دور میں انسان تنہا زندگی بسر کرتا تھا۔ اس مرحلے پر آیا تنہائی شعوری انتخاب تھی یا حالات کا جبر، اس پر آرا مختلف ہو سکتی ہیں، تاہم یہ طے ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے سماجی اور معاشرتی نظامِ حیات کو اپنایا۔ باہمی تعاون، اشتراک اور اجتماعی زندگی نے نہ صرف اس کی بقا کو ممکن بنایا بلکہ اس کے شعور اور فکر کو بھی وسعت عطا کی۔ اس سماجی ارتقا کے باوجود انسان لاشعوری طور پر اپنے گم شدہ ماضی کو کبھی مکمل طور پر فراموش نہ کر سکا۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں

اپنے تجربات اور یادوں کو دل و دماغ میں محفوظ کرتا آیا ہے—خواہ یہ عمل دانستہ ہو یا نادانستہ۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ طویل عرصے تک باقاعدہ علمی، قلمی یا تحریری مواد میسر نہ تھا، تاہم اس کے باوجود انسان کے اندر ایک سادہ مگر مؤثر نظامِ اظہار زندہ و جاوید رہا۔ یہی نظام بعد میں تہذیب و تمدن کی بنیاد بنا۔ ابتدائی انسان نے اظہار کے لیے مختلف علامتی طریقے اختیار کیے، جیسے خاکے کھینچنا، اشکال کندہ کرنا، مورتیاں بنانا، غاروں کی دیواروں پر نشانات ثبت کرنا، اور علامتوں کے ذریعے اپنے احساسات اور مشاہدات کو محفوظ کرنا۔ اسی طرح داستانیں، حکایات اور اساطیر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتیں، یاد کی جاتیں اور آئندہ نسلوں تک پہنچائی جاتیں۔ یہ تمام سرگرمیاں دراصل انسان کی اس فطری خواہش کا اظہار تھیں کہ وہ اپنے حال کو ماضی سے جوڑے اور مستقبل کے لیے محفوظ کرے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ گزرے ہوئے وقت کے حالات و واقعات کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنا انسانی تاریخ کا بنیادی تقاضا رہا ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے خالقِ کون و مکاں نے انسانیت کو ایک اعلیٰ ارتقائی مرحلے سے ہمکنار کیا، جس کی صورت صحائف اور کتبِ آسمانی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان صحائف نے نہ صرف اخلاقی اور روحانی رہنمائی فراہم کی بلکہ انسانی شعور کو تحریر، تحفظ اور تسلسل کا ایسا منظم راستہ دیا جس کے ذریعے ماضی محفوظ، حال منور اور مستقبل بامعنی بن سکا۔ اس طرح انسانی تاریخ، تہذیب اور شعور ایک مسلسل ارتقائی عمل کے تحت آگے بڑھتا رہا اور آج تک اسی تسلسل کی بدولت زندہ و متحرک ہے۔ دنیا کی تاریخ سے اکثر اوقات یہی معلومات میسر آتی ہیں کہ ماضی کے حالات و واقعات سے واقف ہونے کا ذریعہ سینہ بہ سینہ کہانی یا داستان گوئی رہا۔ انہی حاصلات کی بناء پر ہی اکابرین وقت نے اپنے لیے راستے متعین کیے۔

وقت کی بے لگام تیز رفتاری سے ردوبدل ہوتا گیا، لوگوں نے ماضی میں جھانکنے کے لیے نت نئے طور طریقے اختیار کر لیئے مثلاً: کتابت شروع ہونے سے کتابیں تحریر ہونا شروع ہوئیں، قصے، کہانیاں، داستانیں اور تاریخ کو انواع واقسام میں صفحہ ءِ قرطاس پر لانا شروع ہوا۔ معاشرتی نظام نے مزید ترقی کی منزلیں عبور کیں تو ہر چیز کو نفسیاتی طور پر دیکھا جانے لگا یہاں تک کہ تاریخ کا مضمون بھی اس نوع کی چھلنی سے نکالا جانے لگا، کیوں کہ تاریخ کا قابلِ اعتبار ہونا بھی اشد ضروری تھا۔ گو کہ اس عمل میں دشوار گذار مراحل طے کرنا تھے مگر حقائق سب سے زیادہ مقدم تھے۔ انہی وجوہات کی بناء پر سب تکالیف کو عزم صمیم سے جھیلنا تھا۔ تاریخ کو دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ماضی یا تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیئے فرداً فرداً بھی کوششیں ہونے لگیں۔ ویسے تو کسی شاعر نے یہ تک کہہ دیا کہ "یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!" اس کے باوجود بھی گردشِ دوراں کی کروٹوں کی طویل جدوجہد کے بعد ایک دور ایسا آیا کہ چند گنے چنے لوگوں نے اپنی یادداشتیں محفوظ کرنے لگے، بلاشبہ ان کو مستند تاریخ کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا لیکن ،کسی حد تک ان میں بھی تاریخ کے بارے میں خالص اشارے مل سکتے ہیں۔ اس نوع کی یادداشتوں کو آپ بیتی، خودنوشت یا سوانحی ادب کا نام دیا گیا۔ اس طرح ماضی کے جھروکوں کی مختلف زاویوں سے کئی ایک کھڑکیاں کھلتی چلی گئیں اور ماضی اور تاریخ کی جھلکیوں کے انبار لگ گئے۔

آپ بیتی، سوانح عمری اور خودنوشت روزنامچہ، کی اہمیتاس وقت معلوم ہوتی ہے جب ان تینوں اصناف کو اردو زبان میں سوانحی ادب کے نام سے نمایاں کیا گیا۔ انگریزی ادب میں تو اچھا خاصا عرصہ پہلے اس نوع کا ادب اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ سوانحی ادب صرف اپنی ذات یا ایک شخصیت تک محدود ہونے کے باوجود اس دور کی نہ صرف تاریخی بلکہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور ثقافتی حقائق سے پردہ کشائی بھی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ادب سے تاریخی نوعیت کا کام بھی لیا جاتا ہے، اوائلی دور کی تاریخ بادشاہوں اور امراء تک ہی محدود رہتی تھی، اگر حقیقت کی عینک لگا کر مشاہدہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ سُچی، کھری، بنیادی تاریخ اور معاشرت کا منبع عوام

سے ہی ملتا ہے اور وہ تاریخی آثار سوانحی ادب کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ تاریخ اور سوانحی ادب کے متعلق ڈاکٹر محمد عمر رضا اپنی تحریر بعنوان ''اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت '' میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''تاریخ میں عام طور پر کسی خاص عہد کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی فتح و شکست کی داستان بیان کی جاتی ہے جسے مؤرخ اپنے نقطۂ نظر اور مخصوص انداز بیان میں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح واقعات کی ایک خشک کھتونی قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس سوانحی ادب کے تحت وہ تحریریں آتی ہیں جن میں کسی فرد واحد کی زندگی اور اس کے عہد سے وابستہ دیگر ظاہری و باطنی حالات کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانحی ادب اور تاریخ میں امتیاز کے باوجود اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ دونوں کا تعلق ماضی سے ہے اور دونوں میں تحقیق، چھان بین، ماخذوں کا انتخاب اور دیگر ضروری باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جس سے کسی بھی شخص یا عہد کے متعلق بنیادی حقائق منظر عام پر آجاتے ہیں۔''(۱)

بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ جب ایک انسان اپنی زندگی کے بارے میں تحریر کرنے کی جسارت کرتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو کسی بھی طور پر ماحول اور معاشرے سے الگ تھلگ رکھ کر تحریر سامنے لانے سے قاصر ہوتا ہے۔ ارسطو کی کہاوت زبان زدِ عام ہے کہ ''انسان سماجی جانور ہے'' یعنی اکیلا رہنے کے لیے نہیں بنا بلکہ اس کی زندگی کا انحصار معاشرے پر مرکوز ہے۔ یقیناً کوئی بھی شخص معاشرے کے کسی بھی عمل سے علیحدہ نہیں ہوتا، شعوری یا غیر شعوری طور پر ان اقدار و اعمال سے منسلک رہتا ہے۔ یونہی سوانحی ادب کے تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ بغیر تاریخ کا نام لیے تاریخ تحریر کی جارہی ہوتی ہے جس میں دراصل عوامی، سماجی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور حقائق پر مبنی تاریخ کے تانے بانے بنے جارہے ہوتے ہیں۔

عربوں میں ایک رسم تھی جو مدتوں سے چلی آرہی تھی کہ جب بھی کسی کے ہاں اگر بیٹے کی پیدائش ہوتی تو ابتدائی چند ماہ کے دوران اس بچے کو دیہات میں پرورش کے لیئے کسی دایا کی سپردگی میں بھیج دیا جاتا، اس رسم کی بنیادی وجہ یہی ہوتی کہ دیہات کی غیر آلودہ فضا اور خالص غذاؤں کے استعمال کے باعث وہ بچہ صحتمند اور توانا ہو جاتا، دوسری وجہ جو بیان کی جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ خالص خوراک کے ساتھ ساتھ دیہاتوں کی زبان بھی بلکل خالص ہوتی ہے، لہٰذا اس بچے کی گفتگو اور زبان بھی شستہ اور خالص ہو جائے گی، اسی امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نبیٔ آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی پرورش کے لیے دائی حلیمہ سعدیہ چُنا گیا اور ان کے حوالے کیا گیا تھا۔ تاریخ کے ذیل میں بھی غور سے نظر دوڑائی جائے تو کم و بیش ایسے ہی نتائج بر آمد ہونگے، ایک تاریخ وہ ہوتی ہے جو امرأ و سلاطین کی جانب سے تحریر کردہ ہے جس میں عوامی رنگ کی آمیزش نہ ہونے کے برابر ہوگی جب کہ اس برعکس جو عوام میں اندر رہتے ہوئے اپنے حالات بغیر کسی غرض و غایت کے تحریر کرتا ہے تو وہ بے لوث ہو کر انہیں ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے ڈاکٹر صبیحہ انور، ''اردو میں خود نوشت سوانح حیات'' میں ''یادِ ایام'' مصنفہ نواب چھتاری کے پیش لفظ میں سر تیج بہادر سپرو کے تحریر کردہ خیالات سے خود نوشت سوانح حیات میں کے تاریخی پہلو پر بہت زور دیا ہے:

"انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں اس قسم کی کتابیں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ علاوہ اس کے کہ بڑے تجربے کار آدمی کی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے ایسی کتابوں سے خاص فائدہ یہ ہو کہ اس سے ملک کی ترقی و تنزلی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں اور ایسی کتاب سے تاریخ کا مواد تیار ہوتا ہے۔"(۲)

خود نوشت یا سوانح عمریوں کی اہمیت کے موضوعات پر ایک نظر ڈالی جائے کہ مذکورہ ادب میں مصنف کون سے عنوانات کو اپنی تحریروں کی زینت بنانے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کرتا ہے یا کس نوعیت کی تحریروں سے اپنی تصنیف کو پرکشش یا دلچسپ بنانے کی جستجو میں محو رہتا ہے۔ ہر انسان یا خواندہ شخص کی اولین ترجیح ہوتی ہے کہ اس وقت کا یا اس علاقے کا ماحول کیسا ہے، وہاں کے مکینوں کی سماجی زندگی کے صبح و شام کس نوع کے ہیں، مشاغل کیا ہیں، رہن سہن کے لیئے مکانات کی اٹھان، دعوتیں، رسم و رواج، سوچ کے زاویے، حسن و جمالیات کے پیمانے کس انداز کے رواج پذیر ہیں۔ ایک سوانح نگار یا خود نوشت نگار اپنے اوپر اور گردونواح میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور حالات کو کم و بیش حقیقت نگاری کرتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر روشنائی کی مدد سے رقم کرتا جاتا ہے، اپنی تجربات کی روشنی میں ان پر رائے زنی کی بھی سعی کرتا رہتا ہے، اس لحاظ سے وہ حالات زندگی، وہ سماجی اقدار، جمالیاتی اوزان، علمی و عملی روداد یں، عوام کا چلن، ان کی عمومی سوچ اشارے بھی بہ احسن انجام دینے کی بھرپور کوشش میں مگن و مصروف پایا جاتا ہے۔ سماجی و ثقافتی اہمیت وافادیت کے عنوان کی روسے ڈاکٹر محمد عمر رضا اپنی تحریر کے اس پیرائے میں واضح کرتے ہیں:

"سوانحی ادب میں محض سیاسی تاریخ ہی بیان نہیں کی جاتی بلکہ اس میں فرد واحد کے دور کی سماجی، معاشی اور ثقافتی کشمکش کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ سوانحی تحریروں میں کسی نہ کسی زاویے سے فرد واحد کی پوری یا ایک خاص عہد کی زندگی میں جس نوع کی بود و باش، لوگوں کے عادات و اطوار، لباس، طعام، تعمیرات، موسیقی، ادب اور دیگر سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات ہوتے ہیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔"(۳)

اس انداز تحریر کا جو کہ سوانحی ادب کا خاصہ ہے کے اثبات پر ڈاکٹر صبیحہ انور کا نقطۂ نظر بھی دیکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحبہ تحریر میں اپنا موقف اس طرح پیش کرتی ہیں:

"خود نوشت سوانح حیات کا یہ وصف اس منصفانہ خوبی کا غماز ہو بلکہ تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری بھی ہو۔ قدیم ادب میں تقریباً ہر تاریخ اور تذکرے میں مصنف کے حالات زندگی خود نوشت سوانح حیات کی شکل میں ضرور ملتے ہیں اور اگر ان کو یکجا کر لیا جائے تو بہترین نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں کیوں کہ مصنف کی نظر زندگی کے ان تاریک اور باریک گوشوں پر بھی پڑتی ہو جن پر مورخ کی نظر نہیں پڑتی۔"(۴)

سوانحی ادب کے دیگر کئی ان گنت پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے، یہاں پر ایک اور نقطے پر بھی ذرا غور کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ بیتی یا سوانح نگاری میں نہ صرف حالات وواقعات کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ اس میں کئی ایسے نقاط بھی بلا تردد شامل ہو جاتے ہیں جنہیں باریک بینی سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظ سماج ایک جامع مفہوم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں زندگی کی تمام جہتیں شامل ہوتی ہیں، مثلاً ً۔ لوگوں کی عادات واطوار، رسوم ورواج، عوامی سوچ کی صلاحیت، علمی وادبی مشاغل میں سماجی باشندوں کی شرکت، پہننے اوڑھنے کے آداب، کھانے پینے کے شواق۔ زندگی سے پیوستہ ہر ایک کام میں کوئی باطنی حکمت لازماً ً موجود ہوتی ہے گو کہ عوام ان سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی لا محالہ استعمال میں لاتی ہے۔ انہی پوشیدہ خصوصیات یا لوازمات کو نفسیات کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ سوانحی ادب کے نفسیاتی پہلو پر ڈاکٹر عمر رضا اپنی تصنیف میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "سوانح عمریوں کا مطالعہ ہمیں مختلف ادوار کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے اور مختلف افراد کے حالات زندگی اور افتاد مزاج کو بھی۔ اگر بہ نگاہ غور دیکھا جائے تو سوانحی ادب کے مطالعے کے بغیر ہم ایک زمانہ کی تاریخ، اس کی فنی روایت، تہذیبی شعور اور تاریخی ارتقاء کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔"(۵)

مندرجہ بالا بحث کے بعد اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ خود نوشت تصانیف ہوں یا سوانح عمری کی صورت میں تحریریں ہوں ان سب میں اس حقیقت پر اکتفا پایا جاتا ہے کہ اس نوعیت کے ادب میں بہت ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں تاریخ، سماجی آداب واطوار، ثقافتی جولانیاں، ادبی سرگرمیاں، سیاسی منظر نامے، مذہبی اقدار اور شخصی خاکے وغیرہ۔ اسی لحاظ سے اب چند آپ بیتیوں سے اس نوع کی کچھ تحریریں سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے سندھ دھرتی سے جڑے ہوئے ایک ایسے نابغہء روزگار شخصیت کی تحریر کردہ آپ بیتی سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جسٹس (ریٹائرڈ) حاذق الخیری نے اپنی یادداشتوں کو "جاگتے لمحے" کے نام سے قلمبند کیا ہے، ان کی مذکورہ تصنیف سے تاریخ کے حوالے سے اور سماجی صورتحال کے عنوان سے چند اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جسٹس حاذق الخیری نے اپنے کراچی میں آنے کے بعد جو تصویر کشی کی ہے، اس سے اُن دنوں کے کراچی کا عکس، کراچی کی تاریخ، وہاں کے موسمی حالات، مواصلات کی صورتحال کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

> "کراچی وہ نہیں تھا جو اب ہے، نہ نئی دلی جیسی عمارتیں تھیں، نہ وہ سڑکیں اور ہریالی، تیز ہوا کے ساتھ ریت کا ریلا آتا تھا اور ہاتھ پاؤں چہرے اور کپڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا، سائیکل چلانا مشکل ہوتا تھا، اور پتنگ اڑانا ناممکن، آنے جانے کے لیے وکٹوریہ یا محمد علی کمپنی کی ٹرام چلتی تھی، ٹرام میں بیٹھنے میں بڑا مزا تھا۔"(٦)

چند سطروں میں اُس دور کے کراچی کی واضح تصویر کشی ہے، دلی کی عمارات کی خوبصورتی اور دلکشی کی مشابہت کراچی کی عمارات سے کس سادہ اور پُر وقار انداز میں کی ہے، آج کراچی کو روشنیوں کے شہر کا درجہ دیا جاتا ہے اور اُن دنوں کے پتلے پن کو کس نزاکت سے

پیش کیا گیا ہے۔ گویا کہ آپ بیتی نہ ہوئی تاریخ کا ایک ورق ہوئی۔ ثقافت کی جھلک بھی ایسی سادگی سے دکھائی دیتی ہے کہ بغیر زور دینے کے باوجود سامنے آتی ہے، جیسا کہ پتنگ بازی کرنے میں حائل دشواریوں کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ جسٹس حاذق الخیری اپنی خودنوشت میں ایک مقام پر اپنے ہم پیشہ دوستوں یعنی وکلاء کے بارے میں لب کشائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی کتنی گرہیں ایک پیرائے میں بیان کر گئے ہیں، اس سے بہتر تاریخ نویسی کا اہتمام ممکن نہیں، آپ لکھتے ہیں:

> "جب اے کے بروہی صاحب ایڈووکیٹ جنرل سندھ بنے تو انہوں نے 'باوا اینڈ عارفین' نامی ایک وکیلوں کی فرم بنائی، جو بروہی صاحب کے دفتر کورٹ چیمبر میں واقع تھی، باوا بیرسٹر تھے، ان کا تعلق جنوبی افریقہ سے تھا، سنا ہے کہ بڑے اچھے قانون داں تھے، کیس کی بڑی تیاری کر کے عدالت جاتے تھے لیکن جج کے سامنے پیش ہوتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، اس موقع پر عارفین صاحب مقدمہ سنبھال لیتے تھے۔ کچھ اسی قسم کا واقعہ گاندھی جی نے اپنی خود نوشت میں رقم کیا ہے کہ جب انہیں اپنا پہلا کیس ملا تو وہ اسمال کوزز کورٹ کا تھا، مقدمہ دیوانی کا تھا اور جج انگریز تھا، جب گاندھی جی کی باری آئی تو جج نے کہا، یس مسٹر گاندھی، گاندھی جی چپ چاپ کھڑے رہے کچھ نہیں بولے، جج نے کئی دفعہ پوچھا لیکن گاندھی جی اسی طرح کھڑے رہے، آخر کار ڈھیر ہو کر کرسی پر گر گئے، پیچھے سے موکل نے کہا، بابا ہمارا تیس روپیہ واپس کرو۔" (۷)

انسانی فطرت اس امر کی متقاضی ہے کہ بچپن کو اور بچپن کے دوست احباب کو بھلائے نہیں بھلا سکتی کیونکہ اس سِن کی بہت سی پیاری یادیں بار بار دہراتے ہوئے بھلی لگتی ہیں۔ بے فکری، لا ابالی پن، شرارتیں، کھیل کود، کسی قسم کی الجھن، نہ کسی کو دینے کی فکر اور نہ ہی کسی قسم کی پریشانی۔ لہٰذا نو عمری میں ذہنی کیفیت بھی ترو تازہ ہونے کے باعث بچپن کی کم و بیش تمام یادیں ازبر رہتی ہیں۔ عین اسی طرح جوانی کے ایام زندگی بھی کسی بیش بہا یا انمول رتن سے کم نہیں ہوتے، زندگی کی ایک نئی طرز شروع ہونے کو ہوتی ہے، جوش و ولولہ انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے، نئے روحانی و جسمانی رشتے استوار ہوتے ہیں، بود و باش کے لیے نت نئے کاموں کی تلاش ان میں مشکلات اور دلچسپیاں زندگی کی گردش دوراں کو چار چاند بھی لگا دیتی ہیں اور زندگی کے نئے اسباق بھی ذہن نشین کراتی چلی جاتی ہیں۔ آپ بیتی نگار بھی یقیناً اپنی زندگی کے یسے روز و شب اسی تگ و دو میں بتا چکا ہوتا ہے لہٰذا اپنی کہانی جب بھی بیان کرنے بیٹھتا ہے تو ایام طفلی اور ایام شباب کو زیر بحث لائے بغیر رہ نہیں پاتا اور دراصل قاری کے لیے ایسے احوال درس و تدریس کا درجہ رکھتے ہیں اور دلچسپی کا نمونہ ہوتے ہیں، ایسا ہی احوال حاذق الخیری اپنی داستان بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "جب میں نے پریکٹس شروع کی تو لگا گویا بحر بیکراں ہے، جس میں غوطے لگا رہا ہوں، ہجرت سے پہلے کی خوشحالی ختم ہو چکی تھی، ہاں یہ ضرور تھا کہ گھر میں کھانے پینے کو تھا۔ کئی ملازم تھے لیکن میرا باپ دونوں ہاتھ اوپر کئے آسمان کو سنبھالے ہوئے تھا، ہم آٹھ بہن بھائی تھے، بھائی جانکے علاوہ کوئی بھی تعلیم سے فارغ نہیں تھا، بھائی جان ملازم پیشہ آدمی تھے۔ میرا عزیز دوست بدر الزمان جو

میرے ساتھ ڈبکیاں لگا رہا تھا، میڈیکل کالج سے بھاگا تھا کہ مُردوں کو کاٹنا پڑتا ہے، ایک سال گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا، میڈیکل چھوڑ کر یونیورسٹی اور لاء کالج جوائن کیا، ہم دونوں بغیر سہارے اور سرپرستی کے وکالت کے پیشے میں دندناتے ہوئے کود پڑے اور الا کو ہاؤس میں کمپاؤنڈ میں اللہ کا نام لے کر "خیری اینڈ کمپنی" وکیلوں کی فرم بنائی، لیکن موکل ندارد، ہوتا بھی کیسے، نہ ہمارا تعلق میمن، خوجہ یا بوہری برادری سے تھا، نہ ہی دلی کی پنجابی یا جوتے والوں کی برادری سے، باپ ،بھائی۔جج یا وکیل نہیں تھے۔(۸)

فطری تقاضا ہے، انسان بیتے دنوں کو کسی نہ کسی صورت لازماً یاد کرتا ہے گو وہ یادداشتیں بہت دلچسپ ہوں، بہت اچھی ہوں یا تلخ و تشنع ہوں۔ اردو ادب ہو یا کسی بھی زبان میں آپ بیتی اور سوانح عمری میں تصنیف کنندہ اپنے دور کی تمام حرکات و سکنات کی منظر نگاری کر کے اپنی ذہنی اور روحانی تسکین کے ساتھ ساتھ گذشتہ دور کا عکاس بن کر سامنے آتا ہے، دانستہ یا نادانستہ اچھائیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرتا ہوا قلم کی روشنائی سے رقم کر کے آنے والی نسلوں کو اپنے اقدار اور ورثے کو منتقل کرنے کی مقدور بھر کوشش میں ہمہ تن مصروف عمل رہتا ہے۔ڈاکٹر رضوان اللہ خان کی خودنوشت سے چند اقتباس قارئین کی نظر۔ آپ اپنے مسکن کی منظر نگاری کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ساٹھ کی دہائی میں ٹاؤن پلاننگ اور صفائی ستھرائی کے بہترین نظام کی وجہ سے اسے (ٹنڈو آدم) سندھ کا پیرس کہا جاتا تھا ۔زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، صحت، کھیلوں اور ہم نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ چھوٹا سا شہر نہ صرف اپنے باسیوں کو بلکہ ارد گرد کے کئی کلو میٹر رقبے میں آباد گوٹھوں کے رہائشیوں کو بہترین سہولیات مہیا کر رہا تھا۔"(۹)

سماج کی بنیاد عموماً پانی کی موجودگی پر ہوتی ہے، انسانی زندگی بلکہ زندگی بغیر پانی کے ناممکن ہے۔ دنیا کی جتنی بھی قدیم ترین تہذیبیں ہوں یا جدید ترین شہر ہوں پانی کی عدم دستیابی کی وجہ ویران یا آباد ہوئے ہیں۔ زرخیز و آباد کھیت کھلیان ہی زندگی کی نوید ہوتے ہیں۔ اناج، درخت، گھاس، پھل وغیرہ سماجی زندگی کا سرمایہ ہیں ان کے سوا زندگی ناپید ہے۔ڈاکٹر رضوان اپنے علاقے کی ہریالی اور بہترین معاشرتی و معاشی خوشحالی کا تذکرہ ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

"گندم، کپاس اور گنے کی فصلیں، آم، کیلے، شہتوت اور فالسے کے باغات، سبزی منڈی، فروٹ مارکیٹ، ٹیکسٹائل ملیں،، کپاس صاف کرنے کے کارخانے، ہاتھ سے کپڑا بنانے والی کھڈیاں جو بعد میں پاور لومز بن گئیں، برف کے کارخانے، برف کی قلفی بنانے والی فیکٹریاں، دواساز کمپنی، گندم اور کپاس کی خرید وفروخت کے مراکز، مال گاڑیوں سے آنے والے سامان کے گودام، ٹرکوں سے

آنے والے سامان کے لیے گڈز اسٹیشن، شہر کی تجارتی سرگرمیوں کے عکاس
تھے۔"(۱۰)

سماجی و معاشرتی تقاضا ہے کہ تلخیوں اور مشاکل اور بار بار انہی کارہائے کو کرنے یا دہرانے سے مزاج میں تھکن کو دور کرنے کے لیے تبدیلی از حد ضروری ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اس کے مصداق ہر معاشرے یا سماج میں تفریح طبع کے لیے ثقافتی سرگرمیوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ثقافتی اشغال میں بہت سارے اعمال شامل ہیں، جن میں کھیل، لوک شاعری، مقامی کھیل جن میں رسہ کشی، کنیچے، ملاکھڑا (سندھ کی روایتی کُشتی)، لوک موسیقی، لوک رقص، پہیلیاں وغیرہ کے چرچے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان اپنے علاقے کے حوالے سے اپنی خود نوشت میں مزے لے لے کر وہ حقائق بیان کرتے نہیں تھکتے، آیئے ایک جھلک ان کی لفظی تصویر کشی کی دیکھتے ہیں:

"اس شہر کو کھیل دوست شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال کی کئی کئی ٹیمیں موجود تھیں۔ کھیل کے میدان ہمیشہ آباد نظر آتے۔ اس کے علاوہ باکسنگ، کشتی، ملاکھڑا، پتنگ بازی، لٹو بازی، مرغوں کی لڑائی، کتے اور ریچھ کی لڑائیاں، سرکس، موت کا کنواں، فٹ پاتھ پر کرتب دکھانے والے۔۔۔ اس شہر کی رنگینیوں میں اضافہ کرتے رہتے۔"(۱۱)

تاریخ، ثقافت، سماجی آداب و اطوار کو پرکشش انداز میں سوانحی ادب پیش کر کے بام عروج اور دوام بخشتا ہے شاید وہ روکھی پھیکی تاریخی کتابیں اس قدر اثر انگیز اور دلچسپ اور حقائق پر مبنی نہ ہوں۔ تاریخ کی بھاری بھرکم کتابیں شاید چند سماجی پہلوؤں کا احاطہ نہ کریں جتنا خود نوشت اور سوانح عمریاں واضح اور دلچسپ پیرائے میں محفوظ اور منتقل کر سکیں۔ ہر معاشرے میں مخصوص کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جو کہ کچھ علاقوں کا خاصہ ہوتا ہے اور مخصوص علاقوں میں تیار کیا جاتا ہے اور انہیں مرغوب غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گو کہ وہ بظاہر نئی چیز نہیں ہوتی لیکن اس کے پکانے اکا اہتمام دلکش اور انوکھے انداز سے کیا جاتا ہے اور ان کی پیشکش بھی منفرد ہوتی ہے، لہٰذا ایسے کھابے دور دراز تک مشہور و معروف ہو جاتے ہیں، ایسی ہی جھلک ڈاکٹر رضوان اپنے میانوالی کے سفر کے موقع پر ایک کھابے کا ذکر یوں کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں جو کہ خود نوشت میں مذکور ہے۔:

"میانوالی پہنچے تو ابرار نے بتایا کہ یہاں سے ۱۰۰ کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر ایک جگہ ہے وہاں کا رانجھا گوشت بہت مشہور ہے، بالکل ایسے جیسے ٹنڈو آدم کی سجی مشہور ہے۔ وہ شخص تو اب نہیں رہا جس نے اس کا آغاز کیا تھا، اب اس کی بیٹیاں یہ کام کر رہی ہیں اور اس کی بڑی مانگ ہے۔"(۱۲)

آپ بیتیوں میں نہ صرف اپنی ذات کو زیر بحث لایا جاتا ہے مگر اس دوران گردشِ دوراں میں ہونے والے حادثات و واقعات بھی آپ بیتیوں کا بیش بہا حصہ بن کر ابھرتے ہیں اور تاریخ کے تھپیڑے ایسی تصانیف میں جگہ پاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلیویژن کی معروف خبر خواں (نیوز ریڈر) ماہ پارہ صفدر اپنی تصنیف "میرا زمانہ میری کہانی" میں اپنے وقت کی یادداشتوں کی پوٹلی کھولتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

"دس اپریل ۱۹۸۸ء کی صبح اسلام آباد اور راولپنڈی کے شہریوں کو کاہے کو یہ علم ہوتا کہ آج دونوں شہروں میں قیامتِ صغریٰ برپا ہونے والی ہے اور بہت سے افراد جو معمولاتِ زندگی کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے، کبھی گھروں کو واپس نہیں لوٹ سکیں گے۔ مگر ریڈیو پر کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں عمارت سے باہر نکل کر لان میں ذرا اونچائی پر کھڑی ہو گئی کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ دھماکوں کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ خیر اتنے میں ہمارے رپورٹر نے آکر بتایا کہ راولپنڈی کے علاقے فیض آباد میں اسلحے کے ڈپو اوجڑی کیمپ میں موجود سٹنگر میزائلوں اور راکٹوں کے ذخیرے میں آگ لگ گئی ہے، جس سے میزائل چلنے شروع ہو گئے ہیں یہ آوازیں وہیں سے آ رہی ہیں۔ فیض آباد اسلام آباد سے بالکل متصل راولپنڈی کا علاقہ ہے۔ گویا کہ اُس میں موجود اوجڑی کیمپ ریڈیو پاکستان سے چند ہی میل دوری پر تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راکٹ آسمان سے برس رہے ہیں یا زمین سے نکل رہے ہیں۔" (۱۳)

تاریخ کے حوالے سے ماہ پارہ صفدر ایک اور جگہ ایران کے شہر مشہد کے متعلق رقم کرتی ہیں؛

"انقلابِ ایران سے پہلے جب ایرانی جب بہت ماڈرن تھے، تب بھی اہلِ تشیع کے آٹھویں امام رضا سے ان کی عقیدت دنیاوی معاملات سے بالاتر تھی۔ شاہ ایران اور ملکہ فرح کی جو سرکاری تصاویر جاری کی جاتی تھیں، اُن میں وہ امام کی قبر کے گرد جالی کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ یہاں ایک استاد محمد صادق نجفی کا کہنا تھا کہ ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ بارہ سو برس قبل یعنی بارہ صدی قبل یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور امام رضا کی یہاں آمد، شہادت اور قبر کی خیر و برکت ہے کہ ایران میں تہران کے بعد دوسرا ایسا بڑا شہر بن چکا ہے جو ایران کی معیشت میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔" (۱۴)

دنیا کے کسی بھی کونے کے مکین ہوں ان کے معاشرے میں کچھ ایسی مخصوص رسوم و رواج یعنی ثقافتی رنگ ہوتے ہیں جو کسی بھی قوم یا معاشرے کو دوسروں سے منفرد اور جداگانہ شناخت بخشتے ہیں۔ کوئی بھی سوانح عمری ہو یا آپ بیتی ان میں ثقافتی انفرادیت اور شخصیت سے منسلک چند ایسی دلکش و قطعی جداگانہ چیزیں جڑی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کے نیا پن اور منفرد تصور ابھرتا ہے۔ ابوالکلام کی سوانح حیات میں کچھ ایسی ثقافتی نشانیاں سامنے آتی ہیں:

"اُس زمانے میں علاوہ تعلیم کے ایک بہت بڑی چیز مفید مردانہ ورزشیں اور بعض تفریحی کھیل تھے، جن کو سوسائٹی میں بہت اہمیت دی جاتی تھی، مثلاً تیر اندازی، پیراکی، کشتی، پنجہ کشی، خوش نویسی۔ ان تمام چیزوں کو بھی اُنہوں (والد

مرحوم) نے اپنے وقت کے بڑے بڑے استادوں سے حاصل کیا تھا۔ مثلاً خوش نویسی حافظ امام بخش سے جو خط نسخ میں امام وقت مانے جاتے تھے۔ پنجہ کشی حافظ امیر پنجہ کش سے، تیر اکی میر مچھلی سے جو اُس زمانے میں قلعے کے سب سے بڑے پیراک استاد تھے اور تمام شاہ زادے ان سے سیکھتے تھے۔"(۱۵)

آپ بیتی ادب کی ایک نہایت دل چسپ، بامعنی اور ہمہ جہت صنف ہے، جس میں اظہارِ ذات کے لیے کسی خاص علمی سند، منصب یا سماجی مرتبے کی کوئی قید و بند عائد نہیں ہوتی۔ اس صنف کا بنیادی وصف یہ ہے کہ انسان اپنے تجربات، مشاہدات، احساسات اور باطنی کیفیات کو پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ قلم بند کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام فرد—خواہ اس نے کسی بڑے عہدے پر فائز ہو کر خدمات انجام دی ہوں یا نہ دی ہوں اپنی زندگی کے نشیب و فراز، خوشیوں اور تلخیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کو تحریر میں سمو کر ادب میں ایک معتبر آواز بن سکتا ہے۔ آپ بیتی کا دائرہ کار محض شخصی داستان تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ فرد کے ذریعے پورے عہد، سماج اور ماحول کی ترجمانی بھی کرنے لگتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے ہاں بعض ایسے افراد نے بھی آپ بیتی لکھی ہے جو بظاہر ادبی دنیا سے وابستہ نہ تھے، مثلاً سپریم کورٹ پاکستان کے ایک نائب قاصد کی خودنوشت تحریر اس بات کی روشن مثال ہے کہ زندگی کا تجربہ ہی اصل سرمایہ ہوتا ہے، نہ کہ عہدہ یا شہرت۔ اسی تناظر میں جب سابق چیف جسٹس، سپریم کورٹ پاکستان، جناب ارشاد حسن خان کی تصنیف سے اقتباسات سامنے آتے ہیں تو یہ احساس مزید گہرا ہو جاتا ہے کہ آپ بیتی محض ذاتی یادداشت نہیں بلکہ ایک تہذیبی اور ثقافتی دستاویز بھی ہوتی ہے۔ اپنے آبائی شہر میں واقع ثقافتی طرز کی حویلی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے جس انداز سے رہن سہن، اقدار اور خاندانی روایتوں کو بیان کیا ہے، وہ قاری کو ماضی کی سماجی فضا میں لے جاتا ہے اور ایک پورا عہد آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا ہے۔

دنیا کے نقشے پر موجود ہر ملک، ہر قوم اور ہر معاشرہ اپنے وقت کے استعمال، طرزِ زندگی اور سماجی رویّوں میں منفرد شناخت رکھتا ہے۔ ہر قوم اپنی تہذیب اور معاشرتی اقدار کو بہتر اور قابلِ فخر سمجھتی ہے، اور یہی احساس آپ بیتی کے ذریعے بھرپور انداز میں سامنے آتا ہے۔ مذکورہ آپ بیتیوں کے اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خودنوشت یا سوانح عمری کے مطالعے سے نہ صرف فرد کی شخصیت کو سمجھنا آسان ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ، ثقافت، معیشت اور سماجی اقدار کی تفہیم بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی تاریخ کی خام صورت ہے جو فرد کے تجربے سے جنم لیتی ہے اور رفتہ رفتہ اجتماعی شعور کا حصہ بن کر از خود تاریخ کی تشکیل کرتی رہتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۲۲

۲۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۔ ۶۰

۳۔ محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۲۴

۴۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۔ ۶۱

۵۔ محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۲۶

۶۔ جسٹس (ر) حاذق الخیری، جاگتے لمحے، رائل بک کمپنی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۳۶
۷۔ جسٹس (ر) حاذق الخیری، جاگتے لمحے، رائل بک کمپنی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۹۲
۸۔ جسٹس (ر) حاذق الخیری، جاگتے لمحے، رائل بک کمپنی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۹۶
۹۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۵
۱۰۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۷
۱۱۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۷
۱۲۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۳۱۷
۱۳۔ ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۲ء، ص۔ ۱۹۴، ۱۹۳
۱۴۔ ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۲ء، ص۔ ۳۵۴
۱۵۔ ملیح آبادی، آزاد بیتی، دار المصحف، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص۔ ۵۷، ۵۶